ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

صدیق سالک کے ناول اور طبقاتی تفاوت

محمد فاروق
ریسرچ اسکالر پی ایچ۔ڈی (اردو)
ادارۂ زبان و ادبیاتِ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Abstract:
Sadiq Salik is considered one of the prominent novelists in Urdu literature. In his novels, "Pressure Cooker" and "Emergency", he not only highlighted the negative values of Pakistani society but also exposed the exploitative class that is ruining the country's foundations. This class consists of rulers, feudal lords, and government officials who are indulging in selfishness and corruption. Overall, it can be said that Sadiq Salik's novels perfectly reflect the stories of ordinary Pakistanis.

Keywords:
Sadique Salik's Novels and Class Difference

دنیائے ادب میں صدیق سالک نے بطور مزاح نگار قدم رکھا لیکن جلد ہی مزاح نگاری ترک کر کے اردو ادب کی مشکل اور سنجیدہ صنف ناول میں طبع آزمائی کی اور قارئین کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ صدیق سالک نے مزاح نگاری ترک کرنے اور ناول نگاری شروع کرنے کی چند وجوہات کا ذکر کیا ہے:

> "سچ پوچھیے تو مزاح نگاری ترک کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ میرے بس کی بات نہیں رہی، جس شخص نے تین خونی جنگیں، تین دھاڑتے ہوئے مارشل لا اور بہت سے چنگھاڑے ہوئے بحران بھگتے ہوں اور اپنی آنکھوں سے آدھے وطن کو نذر سقوط ہوتے دیکھا ہو اس کے قلم سے خون نہیں ٹپکے گا تو کیا پھول برسیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح لکھنے کی کوشش بھی کرتا ہوں تو قلم سے پھول جھڑنے کی بجائے طنز کے تیر نکلنے شروع ہو جاتے ہیں اور لفظوں کو مسکراہٹ پہنانے لگتا ہوں تو وہ ہیبت ناک ماسک بن جاتے ہیں۔"(۱)

صدیق سالک یوں مزاح نگاری کا میدان چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف آ گئے اور دو مشہور ناول "پریشر ککر" اور "ایمرجنسی" لکھے۔ یہ ناول اردو ادب کے میدان میں اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب رہے اور ان ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے عہد کی گھٹن، معاشرتی و معاشی ناانصافی، طبقاتی استحصال، سیاسی حالات کی خرابی اور حکومتی رویے کی بے حسی کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔

"پریشر ککر" صدیق سالک کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۸۳ء کو مکتبہ سرور راولپنڈی سے شائع ہوا۔ یہ ایک علامتی نام ہے جس کا مصنف نے خوبصورتی سے استعمال کیا ہے نام علامتی ضرور ہے۔ علامتی ناولوں والی تجریدیت اس میں نہیں پائی جاتی۔ اس ناول کو لکھتے ہوئے مصنف نے روایتی ناول نگاروں والا انداز اپنایا ہے۔ ناول کھولتے ہی ہمیں کسی پیش لفظ، مقدمہ یا وجہ تصنیف سے واسطہ نہیں پڑھتا بلکہ براہِ راست قاری کے سامنے کہانی موجود ہوتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ عام روایتی ناولوں سے ہٹ کر ہے۔ اس میں رومانوی داستان نہیں، عاشق اور محبوب کی محبت کے لازوال قصے نہیں بلکہ پاکستانی معاشرے کی زوال پذیری اور طبقاتی تفریق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صائمہ علی لکھتی ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

"پریشر ککر میں پاکستانی معاشرے کے مسائل، جبر، گھٹن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کرداروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہمارے معاشرے کی سچی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ایک غیر روایتی ناول ہے جس میں عشق و محبت کے بجائے معاشرے کے تلخ حقائق کو موضوع بنایا گیا ہے۔"(۲)

ناول کے نام کا انتخاب بہت ہی جاندار ہے۔ مصنف ہماری توجہ پاکستانی معاشرے کی اس تپش اور گھٹن کی طرف دلاتے ہیں جس میں ہر کوئی سماجی پریشر سے پگھلتے جا رہا ہے۔ زمانے کے لالچ اور ہوس پرستی کے باعث معیارات زندگی زوال پذیر ہیں۔ ہر طرف فریب اور جھوٹ کا بازار گرم ہے۔ الغرض کہ پاکستانی معاشرہ زوال اور تباہی کی طرف رواں دواں ہے۔

پریشر ککر کی کہانی فلیش بیک کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ اس کہانی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں، مصنف اور اس کا دوست "فطرت" کی گمشدگی کا پتہ کرنے اس کے گھر اسلام آباد جاتے ہیں۔ دوسرے حصے میں فطرت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ کہانی پیدائش سے لے کر ملازمت کے دوران پیش آنے والے حالات و مصائب کی ہے جب کہ تیسرے حصے میں مصنف اور اس کا دوست فطرت کے گھر پہنچتے ہیں اور انھیں خبر ملتی ہے کہ فطرت بغیر بتائے گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔

"پریشر ککر" کو ایک کرداری ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔ مرکزی کردار فطرت ہے اور ساری کہانی پر چھایا ہوا ہے۔ فطرت کا شوق مصوری ہے لیکن تصویریں بناتے بناتے خود تصویر بن جاتا ہے۔ فطرت کا ایک محب الوطن پاکستانی کا کردار ہے۔ مصنف اس کردار کے ذریعے ہمارے سامنے پاکستانی معاشرے کی حقیقت پر مبنی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ فطرت ایک مصور ہے اور بری جانفشانی سے یہ تصویریں بناتا ہے۔ ان تصویروں میں معاشرے کا جبر، منافقت، طبقاتی استحصال، ظلم و افلاس اور عام آدمی کی بے بسی نمایاں ہے۔ فطرت ایک پاکستانی ہے لیکن اس کی حقیقت پسندی اور سچائی سماج قبول کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے کبھی اس پر سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگتا ہے تو کبھی اس کے پاکستانی ہونے پر سوال کھڑے کیے جاتے ہیں:

"انسانی شخصیت کے کئی رنگ ہوتے ہیں اور وہ بیک وقت اس کے اندر موجود رہتے ہیں ممکن ہے ایک وقت میں ہمیں اس کا سفید رنگ نظر آئے، دوسرے وقت سرخ، تیسری مرتبہ پیلا اور چوتھی مرتبہ بالکل سیاہ۔ قدرت نے انسان میں ان سب رنگوں کا امتزاج پیدا کیا ہے اور وہ حالات کے مطابق اپنا رنگ دکھاتا رہتا ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں پروفیسر شعیب صدیقی کو یوں کمیونسٹوں کے زمرے میں ڈال دینا سراسر زیادتی ہے۔۔۔ آپ میرے خلاف جو چاہیں کہیں اور جس طرح چاہیں محاسبہ کرائیں لیکن مجھے ایک بات بتایئے کیا سماجی انصاف کی بات کرنا کمیونزم ہے یا عین اسلام؟ کیا معاشرے میں غربت و افلاس، جبر، تشدد اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا اشتراکیت ہے یا سماجی جہاد؟"(۳)

فطرت کے پاکستانی ہونے پر، مسلمان ہونے پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن ہمارے سماجی عناصر اپنے اندر اس قدر جبر رکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی مسلم کو غیر مسلم قرار دے کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ ایسے حالات کی منظر کشی صدیق سالک نے کچھ یوں کی ہے:

"انھوں نے ملازمت نہ دینے کا یہ بہانہ گھڑا ہے۔۔۔ کبھی سرخ، کبھی سفید، کبھی روس کا ایجنٹ، کبھی امریکہ کا ایجنٹ، سر میں پاکستانی ہوں، سراسر پاکستانی مجھ پر اور جو تہمت چاہے لگا لیجیے لیکن میری پاکستانیت پر تو شک نہ کیجیے۔"(۴)

فطرت کی یقین دہانی پر بھی اس کے پاکستانی ہونے اور مسلمان ہونے پر شک کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ معاشرے کو سچی تصویریں دیکھنا پسند نہیں۔ اشرافیہ طبقہ کبھی بھی نہیں چاہتا کہ عام آدمی کی زندگی بدل جائے اس لیے معاشرتی رویوں کے مطابق فطرت کو بھی سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے:

"دیکھو فطرت زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ چند اخلاقی قدروں کو بنیاد بنا کر اپنے لیے ایک آئیڈیل وضع کر لو اور پھر ساری عمر اس آئیڈیل کے لیے کام کرتے رہو۔ اس کے لیے تگ و دو کرتے رہو اور جب تک آئیڈیل نہیں ملتا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

پریشان ہوتے رہو، اپنا خون جلاتے رہو۔ اپنی نیندیں حرام کرتے رہو اور اسی حسرت و یاس میں بالآخر پیوند خاک ہو کیونکہ آج تک آئیڈیل ملا ہے نہ ملے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو موم کی طرح نرم رکھو۔ زندگی جو پیمانہ تمھارے سامنے رکھے اس میں فٹ ہو جاؤ۔ پہلے طریقے میں تکلیف ہے رکاوٹیں ہیں۔ پریشانیاں ہیں جنھیں زندگی بھر برداشت کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا جب کہ دوسرے راستہ آسان ہے۔ نسبتاً آرام دہ ہے۔ اس میں اپنی آگ میں بروقت چلتے رہنے کا احساس نہیں ہوتا۔"(۵)

فطرت کے کردار میں مصالحت پسندی کم اور دیوانگی زیادہ ہے۔ وہ سماجی حالات کی ٹینشن سے پریشر ککر کی طرح اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے لیکن اپنے اندر کے خیالات اور سوچ کو باہر نہیں نکالتا۔ اس کے اندر خیالات اور سوچ بھاپ کی طرح پگلائے جاتے ہیں اور وہ اس بھاپ سے تنگ آ کر دیوانگی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی "پریشر ککر" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"یہ معاشرہ جس میں ہم سب رہتے ہیں اور رہنے کے لیے مجبور ہیں واقعی ایک پریشر ککر ہے۔ آس پاس اور گرد و پیش میں جہنم کی سی آگ ہے۔ اس گرمی کی شدت میں افراد پگھل گئے ہیں اور اس سے باہر آنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"(۶)

اب اس کے لیے دو ہی راستے ہیں ایک مصالحت پسندی اور دوسرا دیوانگی۔ فطرت مصالحت پسندی کی بجائے بے باکی اور دیوانگی کے راستے پر چل پڑتا ہے:

"گویا تم نے اصلاحِ معاشرہ کا مشن اپنے ذمے لے لیا۔

"نہیں سر میرا مشن اصلاحِ معاشرہ نہیں صرف معاشرے کی ناہمواریوں، اس کی زیادتیوں اور اس کی ناانصافیوں کو بے نقاب کرنا ہے۔ باقی کام اوروں کا ہے۔"(۷)

پروفیسر سعید کے کردار کے ذریعے ہمارے پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والے طبقاتی فرق کو کھل کر نمایاں کیا گیا ہے۔ پروفیسر سعید ایک سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں اور یونیورسٹی میں فطرت کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بے تکلفی اور دوستی کا بھی تعلق رکھتے ہیں۔ مشکل گھڑی میں پروفیسر سعید ہی فطرت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مصنف نے پروفیسر سعید کے کردار میں ایک زمانہ شناس انسان کو پیش کیا ہے جو نئی نسل کو اپنے مشوروں کے ذریعے زندگی کے مصائب سے بچنے اور زندگی کو آسان بنانے کے گر سکھاتا ہے۔ پروفیسر سعید پاکستانی معاشرے میں طبقاتی فرق کو کچھ یوں نمایاں کرتے ہیں:

"ہر جگہ کی طرح لاہور شہر میں تین طبقے آباد ہیں۔ امیر، غریب اور متوسط۔ ہمیشہ اخلاقی اقدار کی گرفت متوسط طبقے پر سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ وہاں درگزر اور بات سہنے کی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے جب کہ دوسرے دونوں طبقے۔۔۔ مختلف وجوہات کی بنا پر زندگی کے بارے میں نرم رویہ رکھتے ہیں۔۔۔ تو فطرت صاحب آپ کو لاہور میں ایسی جگہ مکان لینا چاہیے جہاں متوسط طبقے کی بجائے بہت امیر لوگ رہتے ہوں یا بہت غریب یعنی یا گلبرگ میں اپارٹمنٹ لے لو یا گوالوں، ماچھیوں اور بھنگیوں کی کسی کالونی میں چلے جاؤ۔ سانده کلاں، سنت نگر، سمن آباد یہ سب متوسط طبقے کی بستیاں ہیں ان میں انگلیاں اٹھیں گی اور تنقید کے تیر برسیں گے۔"(۸)

پروفیسر سعید متوسط طبقے کے حوالے سے ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کرتے ہیں اور فطرت کا تعلق بھی ایک ایسے طبقے سے ہے جو اپنی غیر مصالحانہ رویے کے باعث پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی گھٹن اور ظلم و جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

"اس پریشر ککر میں ہمارے ارد گرد کے افراد کے چہرے صاف دکھائی دیتے ہیں ناموں کو تھوڑا بدل دیا جائے تو وہ اصل روپ میں سامنے آجاتے ہیں۔"(۹)

فطرت کے کردار میں بہت ساری جگہوں پر مصنف کی جھلک ملتی ہے۔ مثال کے طور پر سالک کا بچپن بھی گاؤں میں گزرا۔ فطرت کی طرح سالک کو بھی بچپن میں یتیمی کا دکھ دیکھنا پڑا۔ والد کی وفات کے بعد سالک کو بھی فطرت کی طرح نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ سالک کا بچپن بھی انتہائی تنگ دستی اور کسمپرسی میں گزرا۔ فطرت کی حب الوطنی، حق گوئی اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے میں صدیق سالک کی شخصیت کا پرتو صاف دکھائی دیتا ہے۔ ناول کے بہت سارے واقعات ایسے ہیں جیسے صدیق سالک کی زندگی میں یہ رونما ہوئے ہوں۔ رشید نثار "پریشر ککر" کے حوالے سے کچھ یوں رائے دیتے ہیں:

"صدیق سالک کے فن کا کمال ہے کہ اس کا ناول پاکستان میں لکھے جانے والے ناولوں سے کہانی اور موضوع کے اعتبار سے مختلف اور بے حد اہم ہے۔ اس ناول میں صدیق سالک نے اپنے عہد کی ذہنی کشمکش کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ ایک نازک موضوع کو نہایت نفاست سے چھیڑا اور کامیابی سے کرداروں کے ذریعے پیچیدگیوں کو سلجھایا ہے۔"(۱۰)

ناول میں مصنف نے مختلف کرداروں کے ذریعے مختلف طبقات کو کھل کر بیان کیا ہے۔ چوہدری کرم دین جہاں خیر کا نمائندہ بن کر ابھرتا ہے وہی شرف دین شرفو ایک ہوس پرست اور لالچی انسان ہے۔ اپنے لالچ اور ہوس کی خاطر وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کی زمین ہتھیا لیتا ہے۔ اس کے اندر غرور و تکبر کے ساتھ ساتھ ہوس پرستی اور دولت پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس لیے وہ گاؤں میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور اپنے آپ کو سب سے برتر اور عقلمند خیال کرتا ہے۔ الغرض مصنف نے دیہاتی اور شہری کرداروں کے ذریعے ہمارے معاشرے میں ہونے والے طبقاتی استحصال اور استحصال کی وجہ سے جنم لینے والے طبقات کو کھل کر بیان کیا ہے۔

"ایمرجنسی"، "پریشر ککر" کے دو سال بعد منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے ناول "پریشر ککر" انھیں ناول نگاری کی دنیا میں متعارف کروا چکا تھا۔ لہٰذا ناول نے بھی چھپتے ہی ادب کے قارئین کی توجہ حاصل کر لی اور عوام، خواص میں جلد ہی مقبول ہو گیا۔ اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پاکستانی موجودہ جاگیر دارانہ نظام کی خامیوں اور اس کے خلاف ابھرتی ہوئی بغاوت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انگریز برصغیر سے تو چلے گئے مگر اپنے نمک خوار چھوڑ گئے جو آج بھی ہم پر مسلط ہیں۔ ان جاگیرداروں کی اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو اپنوں سے غداری کے عوض بڑی بڑی زمینوں کے مالک بن بیٹھے۔ اپنی حکومت اور طاقت کا نقشہ برقرار رکھنے کے لیے وہ کبھی بھی غریب عوام کو خوشحال ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ اس ناول کا موضوع بھی ایک ایسے ہی شخص کی کہانی ہے جس کی خواہش ہے کہ ہر کوئی اس کے آگے آنکھیں بند کر کے جی حضور جی حضور کی رٹ لگائے۔ ناول کے موضوع کے بارے میں خود مصنف نے کچھ یوں وضاحت کی ہے:

"اس میں ایک الگ نوعیت کی بھاپ ہے جو پاکستان کے روزمرہ مسائل سے اٹھتی ہے اور ناول کو آگے بڑھاتی اور انجام تک پہنچاتی ہے۔ میرے ناول "پریشر ککر" کی مقبولیت نے میرے اس تاثر کو تقویت بخشی کہ پاکستان کا باشعور قاری رومانوی داستانوں کے علاوہ ملکی مسائل کے بارے میں پڑھنا اور سوچنا چاہتا ہے۔ یہ ناول انھیں مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔"(۱۱)

اس ناول کے مرکزی کردار ملک جابر علی خان ہے جو شانتی نگر کا رہائشی ہے۔ پوری کہانی "شانتی نگر" کے گرد گھومتی ہے۔ اس گاؤں کی آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصے میں غریب لوگ رہتے ہیں اور اس حصے کی حالت ناقابل بیان ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں ملک جابر علی خان کی حویلی ہے۔ اس حویلی اور گاؤں کے باقی مکینوں کے درمیان ایک پکی سڑک کا فرق ہے۔ سڑک کے دونوں اطراف ملک جابر علی خان کا بول بالا ہے۔ شاہین مفتی اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"سالک گاؤں کی زندگی سے بہت مانوس ہے۔ اسے وہاں کی روایات و اقدار، حسرت و آلام، نقصانات و فوائد، وضع قطع، زبان و بیان، تراش و خراش، جہالت، توہم پرستی، توکل برداشت الغرض ہر بات کماحقہٗ حاصل ہے۔"(۱۲)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

ملک جابر علی خاں کے کردار میں مصنف نے روایتی جاگیر داروں والی خوبیوں کو رکھا ہے۔ بہت ساری زمینوں، باغات اور فیکٹریوں کا مالک ہونے کے یہ علاقے کا ابھرتا زمیندار اور وڈیرا ہے:

"ملک جابر علی خاں ابدالی (جنھوں نے ابدالیکالقب پچھلی دو پشتوں سے کم کر دیا تھا) ایک قد آور اور وجیہہ شخص تھے۔ ان کے جسم کی ساخت اور چلنے پھرنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ ان میں نہ صرف خاندانی رعونت کا عنصر موجود ہے بلکہ وہ خود بھی مردانہ مشاغل مثلاً گھڑ سواری، پولو، شکار، تیراکی اور کوہ پیمائی وغیرہ میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔۔۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت خاصی بارعب تھی۔ مونچھوں کی اٹھان، ان کی چال ڈھال اور ان کے بولنے کا انداز بتاتا تھا کہ یہ شخص خدمت کے لیے نہیں حکمرانی کے لیے پیدا ہوا ہے۔"(۱۳)

ملک جابر علی خاں ان لوگوں کا نمایندہ ہے جو دولت کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز کام کرنا جانتے ہیں۔ اس میں انا پسندی اور خود پسندی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ گاؤں کے کسی بھی فرد کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی خواہش یہ ہی ہوتی ہے گاؤں کا کوئی بھی شخص اس کے سامنے سر اٹھا کر نہ نچلے اور یہ غریب دیہاتی ہمیشہ اس کے شکنجے میں جکڑے رہیں۔ ملک جابر علی خاں کا تعلق پاکستان کے ان جاگیر داروں سے ہے جو اپنی دولت مندی میں اور غریب کی غریبی میں اضافہ چاہتے ہیں۔ اس طبقے کی روز اول سے کوشش رہی ہے کہ پاکستانی معاشرے میں معاشی تفاوت اور طبقاتی فرق برقرار رہے:

"حد یہ ہے کہ ہر کوئی میری مرضی، میری خواہش اور میرے حکم کے مطابق چلے خواہ وہ میرے خاندان کا فرد ہو، میرا ملازم ہو یا شانتی نگر کا عام باشندہ! جس کسی نے ذرا روگردانی کی میری خواہش کو نظر انداز کیا یا مجھ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی خواہش کی تو وہ نہ صرف گھاٹے میں رہے گا بلکہ شانتی نگر میں اس کا جینا حرام ہو جائے گا۔"(۱۴)

اس ناول کی دو سطحیں ہیں جنھیں مصنف نے بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک سطح ملک جابر علی خاں اور اس کے اہل خانہ کی پر آسائش زندگی ہے۔ ہر طرف زندگی کی ٹھاٹ باٹھ اور بہاریں نظر آتی ہیں جب کہ دوسری طرف ایسے کردار تخلیق کیے گئے ہیں جو افلاس زدہ زندگی کا عکس پیش کرتے ہیں۔ ان دونوں سطحوں کو پیش کرنے کا مقصد صدیق سالک کا ہمارے سماج میں پائے جانے والے طبقاتی تضاد اجاگر کرنا ہے۔ اس تضاد کی عکاسی مصنف نے کچھ یوں کی ہے:

"حویلی کے جنوب میں ملک کے سولہ مربعے آباد تھے۔ جن میں وافر مقدار میں گندم، کپاس، گنا اور دوسری فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ ملک صاحب نے ان زمینوں سے ملحقہ دوسروں کی زمین خرید کر ٹیکسٹائل ملز اور شوگر ملز لگوا دی تھیں تاکہ سستے داموں خام مال بیچنے کی بجائے اس سے تیار کردہ مصنوعات مہنگے داموں فروخت کی جا سکیں۔ زراعت کے کاموں میں ان کا بڑا بیٹا پرویز علی خاں ہاتھ بٹاتا تھا اور صنعت کاری میں ان کا نائب منجھلا بیٹا قدیر علی خاں تھا دوسرے لڑکے ابھی کالج اور یونیورسٹی کے آخری مراحل میں تھے۔"(۱۵)

ملک جابر علی خان کی حویلی کی آرائش و زیبائش اور مال و دولت کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے بڑی جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ مصنف نے غیر جانبدارانہ انداز میں جاگیر داروں کی مال و دولت اور عیش پرستی کی بڑی جاندار تصویر بھی پیش کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ پاکستانی سماج میں سارا آرام اور مال و دولت انھی وڈیروں اور جاگیر داروں کے لیے ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول:

"اس ملک میں جابر علی خان جاگیر دارانہ نظام کی علامت ہے۔ حویلی اس نظام کا مرکز ہے جس سے معاشرے پر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔"(۱۷)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

ایک طرف ملک جابر علی خاں کی دولت مندی کا نقشہ کھینچا گیا ہے تو دوسری طرف گاؤں میں ہی آباد کلیم الدین عرف کلو کے حالات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ کلیم الدین عرف کلو شانتی نگر کا ایک عام غریب مزدور ہے جو اپنی زندگی کے پہیہ چلانے کے لیے دن رات خون پسینہ ایک کرتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا پسا ہوا کمزور طبقہ ہے کہ جس کے بعض اوقات بھی مخالفت کرتی نظر آتی ہے۔ کلو کا مکان بارش میں گر چکا ہے اور بیٹی کا جہیز بھی بارش کے پانی نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مکان دوبارہ بنانے کے لیے کچھ اینٹیں بناتا ہے لیکن فطرت اس کا ساتھ دینے کی بجائے اس سے غریبی کا بدلہ لیتی ہوئی نظر آتی ہے:

> "کلو پھلاں اور سکینہ رات کو "کھرے" آسمان کو دیکھ کر بڑی تسلی سے سوئے لیکن آدھی رات کو حویلی کے پار سے خلاف توقع کالے سیاہ بادل اُمڈ آئے اور ملک جابر علی خاں کے غصے کی طرح اچانک برسنے لگے۔ گھر میں کوئی ترپال، پرانی دری یا موٹا کپڑا بھی نہ تھا جسے وہ کچی اینٹوں کو تیز بارش کے ہاتھوں پٹتا دیکھتے رہے۔ بالآخر پھلاں سے نہ رہا گیا تو وہ چھٹ کر بارش میں آگے بڑھی اور اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر اینٹوں میں پھیلا دیا۔۔۔ لیکن اس سے کچی اینٹیں کہاں بچ سکتی تھیں، وہ پھر گارا ہو گئیں۔"(۱۷)

ناول میں مصنف نے بے شمار ایسے واقعات تخلیق کیے ہیں جن سے پاکستانی سماج میں پائی جانے والے طبقاتی تفاوت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ مصنف نے ملک جابر علی خاں کے رعب و دبدبہ اور شاہ خرچیوں کا کھل کر ذکر کیا ہے۔ ملک جابر علی خاں کی بیوی ذکیہ اچانک سے ایک واہمہ کا شکار ہو جاتی ہے اور اپنے علاج کروانے کے لیے امریکہ کا انتخاب کرتی ہے:

> "ممی آج ہی واشنگٹن ہسپتال سے فارغ ہوئی ہیں۔ ڈاکٹروں نے لیور لنگز ہارٹ اور دوسرے تمام امپارٹنٹ پارٹس کا اچھی طرح معائنہ کیا ہے۔ تین چار ڈاکٹروں نے تمام ٹیسٹ رپورٹوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور میڈیکل بورڈ نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا ہے کہ ممی کی ہیلتھ ٹھیک ہے بس ذرا ویٹ کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔"(۱۸)

مصنف نے جاگیرداروں کے ہاں دولت کی فراوانی کا یہ عالم دکھایا ہے کہ ذکیہ کی میک اپ کرتے ہوئے نظر اس گوشت کے چھوٹے سے لوتھڑے پر پڑتی ہے جو بچپن سے اس کی آنکھ میں موجود تھا۔ وہ اس بے ضرر گوشت کے لوتھڑے کی سرجری کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سرجری پر تین ہزار ڈالر خرچ کر دیے جاتے ہیں۔ مصنف نے جہاں ملک جابر علی خاں اور اس کے خاندان کی شاہ خرچیوں کا نقشہ پیش کیا ہے وہیں شانتی نگر میں آباد میراں بخش کی بیوی شریفاں کی دردناک موت کا بھی ذکر ہے:

> "پھر صغراں نے تجویز کیا کہ شریفاں کو پچھلی کوٹھڑی میں لحافوں میں لپیٹ کر چھپا دیا جائے اور صحن میں دھوپ میں چارپائی بچھا کر اس پر چرخہ رکھا جائے اور چرخے پر چادر بچھا دیجیے۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ بخار باہر آئے گا، چرخے کو مریض سمجھ کر اس سے چمٹ جائے گا اور شریفاں اندر چھپی رہے گی۔۔۔ وہ وہیں سے خوشی میں چیخ اٹھی "ابا" ابا اماں کا بخار اتر گیا ہے۔ اتنے میں میراں بخش "شکر ہے خدایا، شکر ہے خدایا" کہتا اندھیری کوٹھڑی میں گیا۔ شریفاں کو دو چار آوازیں دیں، جواب نہ ملا تو اسے ہاتھ لگا کر ہلایا پھر جھنجھوڑا۔ وہ کبھی کی ٹھنڈی ہو چکی تھی ہمیشہ کے لیے!"(۱۹)

ناول میں جگہ جگہ ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو ہماری معاشرتی ناہمواریوں اور معاشی استحصال کو پیش کرتے ہیں:

> "نہایت موزوں اور مناسب الفاظ میں چند جملوں کے استعمال سے کردار و واقعات بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔"(۲۰)

ناول "ایمرجنسی" کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصے میں ملک جابر علی خاں کی شان و شوکت، دولت مندی اور "شانتی نگر" کے باقی باسیوں کی مظلومیت کو دکھایا گیا ہے جب کہ دوسرے حصے میں جو کہ پندرہ سال کے بعد کا ہے۔ اس میں "شانتی نگر" کے حالات و واقعات بالکل بدل چکے ہیں۔ اب گاؤں والوں کی سوچ اور قسمت

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

دونوں میں بدلاؤ آگیا ہے۔ گاؤں کے اکثر لوگ ذریعہ معاش کے سلسلے میں بیرون ممالک جا چکے ہیں اور روپے پیسے کی ریل پیل اور تعلیم کے رواج سے ان کی سوچ میں بیداری آ گئی ہے۔ اب وہ ملک جابر علی خاں کی سرداری کو ماننے سے انکاری ہیں اور جلد از جلد ملک جابر علی خاں کی حکمرانی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صائمہ علی گاؤں کے باسیوں کی سوچ میں کچھ یوں تنقید کرتی ہیں:

> "ناول کے دوسرے حصے میں گاؤں والوں کے جو انتقامی جذبات و خیالات پیش کیے ہیں وہ بھی اعتدال پسندانہ نہیں وہ بھی دولت آنے کے بعد جارحانہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوبئی کی اشیا کی نمائش کرتے ہیں اپنی حیثیت کے مطابق اپنی طاقت اور امارت کا اظہار کرتے ہیں۔"(۲۱)

ناول کا اختتام سوچے سمجھے منصوبے کے تحت امید کی کرن دکھاتے ہوئے کیا گیا ہے اور قاری مصنف کی مرضی کے مطابق حالات میں خوشگواری اور اچھے دن آنے کی خوش محسوس کرتا ہے۔ ملک جابر علی خاں گاؤں میں سیلاب آنے کے باعث حویلی کی چھت پر کھڑا سیلاب کا نظارہ کر رہا ہے کہ اچانک اس کی حویلی کی مشرقی دیوار گر جاتی ہے۔ گاؤں والے بھی سیلاب کا نظارہ دیکھنے لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مسلح ہو کر آتے ہیں۔ وہم کے باعث ملک جابر علی خاں خوفزدہ ہو کر گر پڑتا ہے اور حویلی میں کہرام مچ جاتا ہے۔

مصنف نے علامتوں کے ذریعے ہمارے سماج کے مسائل کی جاندار عکاسی کی ہے۔ یہ علامتیں در حقیقت ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی طبقاتی تفاوت کو اور بھی نمایاں کرتی ہیں۔ یہ علامتیں عام فہم ہیں اور مصنف جب دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا ہے تو کسی علامت کا سہارا لیتا ہے۔ ملک جابر علی خان کا کردار بھی ہمارے جاگیرداروں اور حکمران طبقے کی علامت ہے۔ پاکستانی حکمرانوں کا بھی یہ خاصا رہا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھا ہے اور اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے ہر طرح کے اقدامات روا رکھے ہیں:

> "جابر علی ہمارے طبقے میں پائے جاتے ہیں۔۔۔ ایسے شخص کا امیر ہونا، جاگیر دار ہونا، صنعت کار ہونا نسبتاً ثانوی بات ہے ہمارے ہاں مخصوص نظریے کے تحت لکھے گئے ناولوں میں جاگیر داری کو بدی کا سمبل بنا دیا گیا ہے۔"(۲۲)

ملک جابر علی خان کی طرح ان کے چاروں بیٹے بھی پاکستان کے چار صوبوں کی علامت ہیں۔ جیسے ناول کی فضا میں ملک جابر علی خان اور چاروں بیٹوں میں اقتدار کے حوالے سے جو مجبوری اور بے بسی دکھائی ہے ویسے ہی وفاق اور صوبوں میں اختیارات کی تقسیم کے مسائل ہیں عمومی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ وفاق کی نسبت صوبوں کو وہ خود مختاری حاصل نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ ناول کا اختتام بھی علامتی ہے اور حویلی کی مشرقی دیوار کا گرنا بنیادی طور پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا اشارہ ہے۔ مشرقی دیوار کے گرنے کے بعد "شانتی نگر" کے باسیوں کی سرد مہری جو دکھائی گئی ہے وہ بنیادی طور پر پاکستانی حکمرانوں کی نااہلی اور بے حسی کو پیش کرتی ہے۔ ملک کے دو ٹکڑے ہو جانے کے باوجود بھی نااہل حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ گاؤں میں سیلاب آنا اور مشرقی دیوار کو بہالے جانا ۱۹۷۱ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو ظاہر کرتا ہے:

> "یہ مشرقی دیوار مشرقی پاکستان ہے جو حویلی پاکستان کا حصہ ہے۔ وہ حویلی جس پر جاگیر دار وڈیرے اور سرمایہ دار قابض ہیں جہاں عدل و انصاف ان ہی کے لیے ہے۔ جہاں اس سرزمین کے ساری نعمتیں ان کے لیے ہیں اور یہی وہ سب ہے جس نے حویلی کی مشرقی دیوار کو ڈھا دیا ہے۔"(۲۳)

اردو کے بعض ناقدین نے جابر علی خاں کو امجد اسلام امجد کے ڈرامے "وارث" کا کردار "چودھری حشمت علی" سے مشابہ یا متاثر سمجھا ہے۔ چودھری حشمت خاص طرح کی خاندانی عظمت اور جاہ و جلال کا جانشین ہے اور اس کی فطرت میں بھی سخت گیری شامل ہے۔ وہ طبقاتی فرق کا حامی ہونے کے ساتھ ساتھ استحصالی سوچ رکھنے، رعب و دبدبہ والا کردار ہے جب کہ ملک جابر علی خاں دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ وہ اپنی غرض میں افسروں کی خوشامد کرنا جانتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ اپنے مقام و مرتبہ کو مد نظر رکھنے کی بجائے بزدلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر صائمہ علی اس حوالے سے کچھ یوں رقمطراز ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

"سالک نے 'ملک جابر' کو بہت عظیم نہیں دکھایا انھوں نے ملک جابر کو دوہری شخصیت کا مالک قرار دیا ہے جو بظاہر آن بان والا شخص ہے لیکن اندر سے بہت کمزور اور بزدل ہے۔۔۔ چنانچہ یہ کردار ملک حشمت علی سے مشابہ تو ہے لیکن اس کا چربہ نہیں۔ اس مشابہت میں مشترک موضوع اور پس منظر بھی دخیل ہیں۔"(۲۴)

ملک جابر علی خاں کا کردار پورے ناول پر اس قدر حاوی ہے کہ باقی کرداروں کو ابھر کر سامنے آنے کا موقع نہیں ملتا۔ بابا بہشتی بھی اس ناول کا جاندار کردار ہے جو خصوصیات میں ملک جابر علی خاں کے بالکل متضاد ہے۔ اس کردار کے اعمال اور گفتگو سے اشفاق احمد کے "بابے" کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ یہ روایتی کردار ہے جو نیکی اور اصلاح کی طرف معاشرے کو راغب کرنا چاہتا ہے۔ "مرجان" تیسرا اہم کردار ہے جسے سب شکارن پکارتے ہیں۔ مرجان شکارن ایک تیز طرار اور بے باک عورت ہے جو اپنی چال ڈھال، بول چال لباس اور اداؤں سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ ناول کی زبان سادہ اور عام فہم ہے اور کسی طرح کا تصنع اور تکلف ہمیں نظر نہیں آتا۔ تحریر میں روانی اور سلاست ہونے کے ساتھ روکھا پن نہیں ہے۔ مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ ادبی تحریروں والے معیار کو برقرار رکھا جا سکے۔ مصنف نے طبقاتی فرق کو اجاگر کرنے کے لیے جہاں کرداروں سے کام لیا وہیں لسانی اعتبار سے معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ رعایت لفظی کے خوبصورت استعمال پر مصنف داد کا مستحق ہے:

"ملک صاحب کی زمین پھیلتی گئی اور عام دیہاتیوں کی سکڑتی گئی۔"(۲۵)

"حویلی کے کلس بہت اونچے اور گاؤں کے مکان بہت نیچے تھے۔(۲۶)

شکاری کتوں کی زبانیں لٹک رہی تھیں لیکن مزارعوں کی زبانیں دائمی طور پر بند تھیں۔"(۲۷)

مجموعی طور پر صدیق سالک کے دونوں ناولوں میں جاگیردارانہ نظام کی خامیاں، غربت و امارات کا تقابل دیہاتی زندگی کے مسائل، شہری زندگی کی گھٹن، کمزور طبقے کی محکومیت اور طاقتور طبقے کی حاکمیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ صدیق سالک کے تخلیقی کردار ہمارے ارد گرد نظر آتے ہیں۔ یہ کردار معاشرے میں درپیش عام پاکستانی کے مسائل اور ناانصافی کی طرف قاری کی توجہ دلاتے ہیں۔ وہ ایک سچے مسلمان اور محب وطن پاکستانی ہونے کے ناطے نہ صرف پاکستانی معاشرے میں موجود مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ کمزور طبقے کی لاچاری اور بے بسی کے ساتھ ساتھ حاکم طبقے کے غلط فیصلوں کے خلاف آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ صدیق سالک، "انٹرویو" مشمولہ روزنامہ جنگ، راولپنڈی: ۱۰/ فروری ۱۹۸۶ء

۲۔ ڈاکٹر صائمہ علی، صدیق سالک۔ شخصیت و فن، (لاہور: بک ہوم، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۹۹

۳۔ صدیق سالک، پریشر ککر (لاہور: الفیصل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۱۲۔۳۱۳

۴۔ صدیق سالک، پریشر ککر، ص ۱۷۷

۵۔ صدیق سالک، پریشر ککر، ص ۲۲۲

۶۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، "گفتگو" مشمولہ روزنامہ جنگ (لاہور: ۱۴/ دسمبر ۱۹۸۳ء)

۷۔ صدیق سالک، پریشر ککر، ص ۱۷۹

۸۔ صدیق سالک، پریشر ککر، ص ۲۲۴

۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "پریشر ککر"، رسالہ اوراق (لاہور: جولائی اگست ۱۹۸۴ء)، ص ۲۵۲

۱۰۔ رشید نثار، روزنامہ نوائے وقت (راولپنڈی: ۱۱/ فروری ۱۹۸۴ء

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

۱۱۔ صدیق سالک، "پیش لفظ"، مشمولہ ایمر جنسی (راولپنڈی: مکتبہ سرمد، ۱۹۹۴ء)، ص ۹
۱۲۔ شاہین مفتی، "صدیق کا نیا ناول ایمر جنسی"، مشمولہ فنون (دسمبر ۱۹۸۶ء)، ص ۲۶۴
۱۳۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، (راولپنڈی: مکتبہ سرمد، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۸۔۲۰
۱۴۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، ص ۹۵۳
۱۵۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، ص ۳۱
۱۶۔ ایمر جنسی کی تعارفی تقریب، کراچی: ۲۰/ جنوری ۱۹۸۶ء
۱۷۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، ص ۳۶
۱۸۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، ص ۱۱۰
۱۹۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، ص ۱۱۷
۲۰۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، رسالہ اوراق (لاہور: جولائی اگست ۱۹۸۴ء)، ص ۲۵۳
۲۱۔ ڈاکٹر صائمہ علی، صدیق سالک۔ شخصیت و فن، ص ۲۲۳
۲۲۔ صدیق سالک، "انٹرویو"، مشمولہ روزنامہ جنگ (راولپنڈی: ۱۰/ فروری ۱۹۸۶ء)
۲۳۔ ایمر جنسی کی تعارفی تقریب منعقدہ ۲۰/ جنوری ۱۹۸۶ء
۲۴۔ ڈاکٹر صائمہ علی، صدیق جاوید۔ شخصیت و فن، ص ۲۲۲۔۲۲۴
۲۵۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، ص ۱۷
۲۶۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، ص ۲۱
۲۷۔ صدیق سالک، ایمر جنسی، ص ۲۶